حقیقی تصوف کی اہمیت
اور ضرورت
مؤلف
الحاج قاری محمد ارشاد علی
مولوی عالم (نظامیہ) بی۔کام (عثمانیہ)
خادم تدریس القرآن

تفصیلات طباعت

نام کتاب	حقیقی تصوف کی اہمیت اور ضرورت
مؤلف	الحاج قاری محمد ارشاد علی
صفحات	۳۱
اشاعت	دسمبر ۲۰۱۷
قیمت	مُفت
اہتمام	صاحبزادہ محمد طاہر علی
ای میل	islahitohfa@gmail.com

مزید موضوعات

http://archive.org/details/@islahi_tohfa

تنبیہ

ترتیب

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

حقیقی تَصَوُّف کی اہمیت اور ضرورت

معالجہ روحانی، یا روحانی امراض کے علاج کا دوسرا نام "تَصَوُّف" پڑ گیا۔ حالانکہ اس کا قرآنی نام "تزکیہ" ہے اور حدیث و سنت کی اصطلاح (terminology) میں اس کو" احسان" کہتے ہیں۔

"ما الإحْسَانُ؟ قالَ: أنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأنَّكَ تَرَاهُ "

یوں بھی اصطلاحات، تنازعہ (controversy) کی چیز نہیں ہے اور ناموں کے اختلاف سے حقیقت نہیں بدلتی اور اہمیت میں فرق نہیں پڑتا۔ طِبِّ قُلُوب و اَرْواح (رُوَاح جمع ہے روح کی اور اس سے مراد قانون طِبّ (medicine principles of) ہیں) یا فقہ باطن یا تزکیہ نفس و احسان کا یہ علم جو تَصَوُّف کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ یہ دراصل دین کا ایک شعبہ اور اسلام کا ایک رُکن ہے۔ یہ شریعت کی روح سے دین کا لُبِّ لُباب (conclusion) اور اسلامی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے اور جب تک ہم اس شعبہ کی طرف پوری پوری توجہ نہیں کریں گے اس وقت تک دین میں کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح نہ انفرادی سطح پر کسی کی اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ اجتماعی سطح پر زندگیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ صحیح معنی میں زندگی کا لطف آ سکتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کے مقاصد بعثت میں اس کو بیان کیا گیا ہے اور جو اوصاف تعلیم کتاب و حکمت وغیرہ میں بیان کیے گئے ہیں، ان اوصاف میں رسول خدا کی مخصوص صفت تزکیہ ہے۔

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (سورہ جمعہ : ۲)

تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ قرآن کو صرف پڑھ کر سنا دینے اور سمجھا دینے میں اکتفانہ کریں، بلکہ اس تلاوت اور تعلیم کا رنگ قاری پر چڑھا دیں کہ اس کی تعلیم کو اس کے کانوں اور دماغوں سے گزار کر ان کے قلوب اور ارواح کو رنگین کرتے ہوئے ان کے اعضاء وجوارح سے تعلیم کو عمل کی صورت میں جاری کروادیں۔

اسی لیے رسول اکرم ﷺ دنیا کے سب سے کامیاب ہادی اور مرشد تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی حیرت انگیز روحانی، اخلاقی، ذہنی، عملی تبدیلی اور اسلام کی ابتدائی کامیابی کا راز یہی تھا اور آج اس کی کمی اسلامی زندگی کے ہر گوشے میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر پھیلی ہوئی ہے۔

انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد پورا کرنے کے لیے تزکیے کا منصب بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی کتاب و حکمت کی تعلیم ضروری ہے، یا یوں سمجھ لو کہ یہ تعلیم ہے تو وہ تربیت ہے اور تکمیل انسانیت کے لیے دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ تزکیہ کی کمی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے باوجود اسی طرح محسوس ہوتی ہے جس طرح کھانے میں نمک کی کمی اور دونوں کے نتائج میں وہی فرق ہے۔

جس کو اکبر الہ ابادی نے بیان کیا:

زبان گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

اور یہ حقیقت آج کل کے دور میں روز بروز واضح ہوتی جا رہی ہے کہ دین جس چیز کا نام ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ دینی تعلیم سے بھی پیدا نہیں ہوتا۔

دل اور دماغ کا فرق: دماغ کئی زبانیں جانتا ہے، اور دل صرف ایک زبان جانتا ہے۔ دماغ کئی زبانیں جان کر، زبان سے اعلیٰ سے اعلیٰ تقریر کرتا ہے، لطیف نقطے پیدا کرتا ہے، فلسفیانہ بحثیں کرتا ہے، لیکن دل صرف ایک ہی زبان جانتا ہے وہ ہے "محبت کی زبان"، انصاف کی زبان، دل فلسفیوں سے نہ سمجھے گا، دل اللہ کا نام لینے پر بیدار ہو جاتا ہے، اللہ کے نام کی دہائی دو تو دل سب کچھ نچھاور کرے گا، دل کو جگا لینے اور خیر کے راستے پر ڈالنے اور دل میں انسان کی محبت پیدا کر لینے کے بعد پھر کسی خیر کی کمی کا احساس نہ ہوگا۔

صحبت کا بدل کوئی نہیں ہے

اگر کوئی بدل ہوتا تو پھر صحابہ کرام کو صحابہ نہ کہا جاتا، اولیاء، اصفیاء (اولیاء اللہ) یا کوئی اور خطاب دیا جاتا، کثرت عبادت اور ذکر و تسبیح میں بھی تابعین حضرات بڑھ گئے تھے لیکن کوئی صحابہ کے مقام مرتبہ کو نہ پہنچ سکا، صحبت میں اللہ تعالیٰ نے بڑی تاثیر رکھی ہے۔ چنانچہ لمحوں میں اس سے جو فائدہ ہوتا ہے وہ کسی بڑی ذہانت سے، مطالعہ سے بھی نہیں ہوتا۔ اسی سے حرارت نورانیت اور اعتدال پیدا ہوتا ہے اور اسی سے کسی چیز کا اعتبار اور اس کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے، جو نہ کتابوں میں ملتی ہے اور نہ علم سے حاصل ہوتی ہے۔ گویا یہ ایک چراغ ہے، چراغ سے چراغ جلتا ہے اور صحبت کی تاثیر کے واقعات تو تواتر سے ثابت ہیں۔

اخلاص اور اخلاق

اللہ کے ساتھ اخلاص اور لوگوں کے ساتھ اخلاق ضروری ہے۔ اخلاق تو اہل اللہ کے پاس ہوتے ہیں، لیکن لوگ بزرگوں کے پاس کشف و کرامات دیکھنے آتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس ان کے اخلاق دیکھنے آنا چاہیے۔

انسانی مزاج میں داخلیت اور خارجیت: (اس کی تشریح)

انسانوں کی طبیعت مختلف ہوتی ہیں۔ اُفتاد (فطرت) اور مزاج سب کے یکساں نہیں ہوتے۔ کچھ لوگوں کے مزاجوں میں داخلیت بہت کم اور خارجیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ شہر میں کیا ہو رہا ہے؟ ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ اور دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ ان کو ان سب کی خبر رہتی ہے۔ ان کی زندگیوں پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے۔

سارے جہاں کا جائزہ، اپنے جہاں سے بے خبر

اپنے حال سے بے فکری اور بے خبری اور سارے جہاں سے باخبری عہد حاضر کی شناخت بن گئی ہے۔ عصر حاضر کا انسان سب کچھ جانتا ہے اور اگر نہیں جانتا تو اپنے بارے میں نہیں جانتا۔

بہت ہے شور زمانے میں آگہی کا مگر
جو اپنے رب کو نہ جانے وہ آگہی کیا ہے؟

معلومات کی اسکے پاس کمی نہیں ہے۔ انٹرنیٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، کلچر آج چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ ٹی۔وی، نیوز چینل، انٹرنیٹ، اخبارات، میگزینس کی بھرمار ہے، خبروں کا طوفان ہے، لیکن داخلیت کا فقدان ہے، دل کے اندر کی ہنگاموں سے واقفیت نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے دین اور یقین دونوں ڈگمگا رہے ہیں۔ باطنی شکست اور اندرونی خرابیوں اور اندرونی، روحانی اور اخلاقی بیماریوں کی کثرت ہو گئی۔

ذہنی انتشار (confusion)، ثابت قدمی، ثابت توجہ، سکون، اور اطمینان سے کام کرنا کا عادی ہو جانا، بے حساب حرص و طمع، دکھاوا اس موجودہ زمانے کی شناخت بن گیا ہے۔ اس دور کے بے چین اور بے قرار دل کو اور دماغ کو صرف تَصَوُّف

کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے۔ اصطلاح تَصَوُّف کی تشریح سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ تَصَوُّف تین چیزوں کا نام ہے:

(۱) تلاش حق

(۲) معرفت حق

(۳) تزکیہ نفس (اخلاق)

جہاں تک تلاش حق کی بات ہے تو تَصَوُّف اور فلسفہ دونوں باہم مشابہت اس اعتبار سے رکھتے ہیں کہ دونوں کے نزدیک ایک بات مشترک ہے اور وہ ہے "حقیقت کی جستجو" یعنی فلسفہ بھی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے اور تَصَوُّف بھی۔ لیکن تَصَوُّف کے برخلاف فلسفہ نے عقل انسانی کو اپنا رہبر مان لیا ہے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نزدیک کائنات کا جوہر اصلی اور وجود حقیقی عقل ہے اور ہر چیز عقل کی مظہر ہے، وہی ان لوگوں کے نزدیک مأخذ وجود ہے اور وہی ان کے پاس معیار صداقت ہے۔ لیکن فلسفیوں میں سے کچھ فلسفی نے عقل کی محدودیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہیں۔ جیسے جرمنی "فلاسفر کانٹ" نے عقل اور منطق کے خلاف دلیلیں دیں۔ جس کی وجہ سے عقل کی عمارت گر گئی۔ اس نے عقل محض کو خیال خام (silly idea) میں سے تعبیر کیا اور اس نے کہا کہ عقل کے ذریعے خدا کے وجود کا پتہ نہیں چل سکتا اس کے ذریعے نہ تو کائنات کی ابتداء کا پتہ چلتا ہے اور نہ انتہاء کا، نہ ہستی کا، نہ ازل کا نہ ابد کا۔

اسی بات کو اقبال نے بیان کیا ہے:

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے کہ نہیں ہے

ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

اس کے بعد ایک اور فلسفی آیا، جس کا نام برگسان تھا،اس نے کہا کہ حقیقت کی کھوج عقل کے ذریعے نہیں ہو سکتی بلکہ وجدان (Intution) سے کی جا سکتی ہے۔یہ گویا مذہب کی منزل کی طرف ایک مثبت اقدام تھا، بلا وحی اور بلا وجدان مادیات اور طبیعیات میں گھری ہوئی عقل کی رسائی حق تک نہیں ہو سکتی۔

بقول اقبال کے :

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

بہر حال وہ فلسفہ ہو یا تَصَوُّف ہو، عقل ہو یا وجدان۔ دونوں کے مزاج میں داخلیت ہے، منزل کی تلاش ہے، گہرائی ہے، دروں بینی ہے، تحلیل و تجزیہ ہے، باطن شناسی ہے، گہرائی کے ساتھ اسباب اور نتائج کی جستجو ہے۔

داخلیت کی اہمیت

داخلیت یعنی فلسفیانہ تفکر کے ساتھ اگر کوئی شخص کسی بھی کام یا موضوع سے وابستہ ہوتا ہے تو اس کا انداز بھی فلسفیانہ ہوتا ہے،اس کا زاویہ نظر اور زاویہ فکر بھی فلسفیانہ ہی ہوگا۔ جیسے: اگر کوئی سیاست یا صحافت سے قریب ہوتا ہے تو اس کا تعلق ہر روز کے تغیرات اور حادثات سے ہو جاتا ہے۔ تو اس کی نظر دور بین نتائج کو دیکھے گی۔اس کے بعد وہ جو کچھ بھی قومی اور بین الاقوامی حالات کے بارے میں کہے گا تو اُس میں فلسفیانہ تجزیے کی جھلک نظر آئے گی۔ چنانچہ اسکی تحریر مفکرانہ ہوگی، اسکی گفتگو میں گہرائی ہوگی۔ صرف ظاہری باتوں کی حد تک رسمی صحافتی رپورٹنگ نہیں ہوگی۔

داخلیت کی اس قدر زیادہ اہمیت ہے کہ اس کے بغیر شخصیت میں اور تحریر میں اور تقریر میں وزن اور وقار پیدا نہیں ہو سکتا۔ اِسی طرح ادب کی دنیا میں بھی نظم اور نثر میں گہرائی فلسفہ ہی کی وجہ سے آئی ہے۔ میرا اصل موضوع تو حقیقت اور اہمیت تَصوُّف ہے۔ تَصوُّف اسی داخلیت کا نام ہے جس کے ذریعے تلاش حق اور معرفت حق ممکن ہے۔

غور و فکر، تعمُّق (بات کی تہ تک پہنچنا)، اور خاموشی کی عادت تَصوُّف کے لوازم سے ہے۔ فلسفے کے ذریعے ایک فلسفی کو گہرائی کے باوجود خدا نہ مل سکا۔اور سائنس فلسفہ (وہ علم جو اشیاء کی حقیقت اور ان کے وجود کے اسباب پر بحث کرتا ہے) سے الگ چیز ہے اور اس کی دنیا محسوسات تک محدود ہے۔ چنانچہ ابتداء میں سائنس بھی خدا کی تلاش میں رکاوٹ ڈالی اور وہ عقلی تجربے کی قائل تھی۔ مادی اور تجرباتی نقطہ نظر غالب تھا اور جو چیز کہ تجربے میں نہ آتی ہو تو سائنس اس کا انکار کرتی۔ اس لیے اور اسی وجہ سے سائنسداں مابعد الطبیعاتی حقائق کا مذاق اڑانے لگے اور کہنے لگے کہ مذہب آخر کار شکست کھا کر اکھاڑے سے بھاگ گیا۔

چنانچہ سائنسدان " (آلڈس ہکسلے) Aldous Huxley" نے کہا کہ سائنس ایک ایسا دھماکہ ہے جس سے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، بے اعتمادی عام ہوئی، اور مذہبی گھرانوں پر بھی اس بات کے خاموش اثرات پڑے، صحیفۂ آسمانی کی تلاوت کے بجائے صرف اخبارات کے مطالعے کی عادت پڑ گئی، سیاست نے مذہب کی جگہ لے لی، زبان خدا اور رسول کے ذکر کے بجائے سیاست دانوں اور لیڈروں کے ذکر سے تر رہنے لگی۔ لیکن خود سائنس کی دنیا میں "آئین اسٹائین" کا نظریۂ اضافت ایسا دھماکہ ثابت ہوا کہ بقول " برٹرینڈ رسل (Bertrand

William Russell)" مادہ بحیثیت جوہر Atom تحلیل ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ نفس، روح اور عقل کی اہمیت پھر سے تازہ ہو گئی۔

" آئین اسٹائن" نے کہہ دیا کہ سائنس بغیر مذہب کے لنگڑی ہے اور مذہب بغیر سائنس کے اندھا ہے۔ چنانچہ پھر یہاں سے سائنس کا رخ مادیت سے روحانیت کی طرف مڑ گیا۔ سائنسداں "جیمس" نے کہا کہ ہمارے ذہن کی طرح ایک ابدی، آفاقی اور عالمگیر ذہن بھی موجود ہے۔ چنانچہ " برطانوی فلکیاتی سائنسداں آرتھر ایڈنگٹن" نے آفاقی ذہن کے نظریے کی تائید کی، تو "جورج برکلے George Berkeley" نے فلسفے میں ابدی روح کا نظریہ پیش کیا۔ گویا سائنس جو پہلے مذہب کا انکار کرتی تھی وہ اب مان لی کہ مذہب کا وجود ہے۔

آفاقی ذہن دراصل خدا کا دوسرا نام ہے

فلسفہ ہو یا سائنس دونوں کے ذریعے، ایک انسان خدا کا قائل تو ہو جاتا ہے، لیکن قائل ہو جانا الگ بات ہے اور پا لینا الگ بات ہے۔ پا لینا معرفت اور تقرب حاصل کرلینا ہی اصل ہے۔ یوں تلاش حق میں سائنس اور فلسفہ دونوں تَصَوُّف کے ہمسفر ہو سکتے ہیں، لیکن معرفت حق یعنی دوام حضوری کی نعمت تَصَوُّف ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور تَصَوُّف سے مراد حقیقی تَصَوُّف ہے، اسی کا نام "احسان" ہے۔ اس کو مذہبی وجدان بھی کہہ سکتے ہیں۔ اصطلاح زیر بحث نہیں ہے کیونکہ :-

الفاظ کے پھندے میں الجھتے نہیں دانا
صیّاد کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے !

بڑے بڑے اہل عقل اور اہل خرد کی زندگی میں یہ مرحلہ ضرور آتا ہے کہ وہ وجدان کی پناہ لیتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃاللہ علیہ کے ساتھ بھی یہ پیش آچکا ہے، انہوں نے عقل اور منطق اور ظاہری علوم کی تدریس کو چھوڑ کر جنگلوں کی خاک چھانی اور یہ اعلان کیا کہ حقیقت کی راہ تصوف کی وادی سے ہو کر گزرتی ہے اور علم کو جب تک وجدان کی کسوٹی پر نہ کسا جائے، اس وقت تک حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے۔امام غزالی رحمۃاللہ علیہ نے اس کے لیے عقل نبوی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اقبال بھی اسی تائید میں ہیں کہ حقیقت تک رسائی کے لیے عقل (خرد) کافی نہیں ہے

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنون
یہ تو خود بھٹکی ہوئی پھرتی ہے رہبر ہم ہیں

تیری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا
سرحد عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے

اقبال کبھی کشمکش، قلب و عقل اور کشمکش فلسفہ و وجدان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومیؔ کبھی پیچ و تاب رازیؔ

اس طرح سائنس محسوسات کا نام ہے اور فلسفہ معقولات سے عبارت ہے، تو تَصَوُّف حواس باطنی سے جسکو وجدان کہتے ہیں ادراک حقیقت کا نام ہے۔روحانی وجدان اکثر ناقابل اظہار ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ غیر معتبر ہوتا ہے۔ایمان کی چاشنی جس کو حدیث میں حلاوۃُالایمان کہا گیا ہے، وہ بھی اظہار سے ماورا چیز ہے۔اس کو الفاظ کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا یا یوں سمجھو کہ وہ الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔اسی طرح روحانی وجدان اور تَصَوُّف اور سلوک کے مقامات بھی اپنی حقیقت رکھتے ہیں، لیکن ہماری اطاعت اس قدر اتھلے ہو گئے ہیں اور مزاج میں اس قدر سطحیت آگئی ہے کہ تعمق (بات کی تہ تک پہنچنا)،اور غور و فکر کی عادت ختم ہو گئی ہے۔یہ سب داخلیت کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ باطنی ترقی کی ہم کو فکر ہی نہیں ہے اور خارجیت اس قدر زیادہ ہو گئی ہے کہ اِسی کو سب کچھ سمجھا جارہا ہے اور اِسی میں مست بھی ہیں:

کہاں پہنچا دیا احساس خوش فہمی نے لوگوں کو

سر مقتل کھڑے ہیں زندگی کی بات کرتے ہیں

اسلام میں ترقی باطن اور اصلاح حال کی فکر کی اہمیت اس قدر ہے کہ صوفیاء حضرات نے تھوڑی سی داخلیت کو ضروری قرار دیا ہے، صوفیاء نے نفی و اثبات یا اسم ذات کے ذکر کی تلقین اِسی لیے کی ہے کہ خارج میں اور نفس پرستی میں حد سے بڑھی ہوئی مشغولیت کو حد میں رکھنا چاہیے، ورنہ وہ محبت الٰہی اور معرفت حق کے راستے میں خارج ہوتی ہے، پھر انسان خواہشات اور انسانی تعلقات میں الجھ کر حق کے راستے سے دور ہو جاتا ہے اس طرح تَصَوُّف نہ تو دعوت خلوت نشینی دیتا ہے اور نہ ترک دنیا کی اور نہ حیات گریز امر کی اور نہ زندگی سے فرار کی،البتہ تزکیہ

نفس اور تزکیہ اخلاق ہم سب کی ضرورت ہے مصیبت کی تربیت اور شخصیت کی تعمیر کے لیے تَصَوُّف سے صرف نظر ممکن نہیں ہے:

علم تَصَوُّف کی خدمت ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے۔

۱- سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃاللہ علیہ

۲- حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃاللہ علیہ

۳- حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی رحمۃاللہ علیہ

۴- شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃاللہ علیہ

اپنے اپنے دور کے امام اور اس فن کے مجتہد مطلق تھے۔ ان کے بعد بھی ہر ایک سلسلے میں وقفہ وقفہ سے مجدد اور مجتہد پیدا ہوتے رہے۔ جیسے :-

مجدد الف ثانی، سید آدم بنوری، حضرت سید احمد شہید، حضرت شاہ غلام علی اور دور آخر میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی وغیرہ یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنے اپنے دور میں مقاصد کے لیے وسائل کا انتخاب، اجزائے سلوک میں حذف واختصار اور اس کو مؤثر اور سہل بنانے میں نمایاں اجتہاد سے کام لیا۔ اس سلسلے کی ایک طلائی کڑی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی ذات تھی کہ ان کو ایسا زمانہ ملا جس میں نئے نئے تمدنی مسائل ومشکلات آگئے، زندگی کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں، قوائے جسمانی اور طبیعتیں کمزور اور سہولت پسند واقع ہوئی تھیں، دوسری طرف لوگوں میں تَصَوُّف اور سلوک سے ایک طرح کی وحشت اور خوف اور بعض تعلیم یافتہ طبقوں میں انکار کا رجحان پایا جاتا تھا۔

ان سب باتوں کا تقاضا تھا کہ کوئی اپنی مجتہدانہ صلاحیت سے اس علاج و معالجہ کو سہل اور عمومی اور ہر طبقے کے لیے قابل عمل اور باعث کشش بنا کر اس میں ایک

نئی روح پھونک دے، تاکہ یہ تزکیہ والی محنت کو مرجع عام و خاص بنادے۔ چنانچہ یہ کام انہوں نے کیا اور ان کو دو زبردست شارے اور ترجمان اور رمز شناس مل گئے، وہ تھے مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا سید سلیمان ندوی، جنہوں نے مولانا کے اس طرز اصلاح اور تجدید تَصَوُّف اور سلوک کو اور زیادہ مقبول اور وسیع بنادیا اور ان کے مضامین اور مقاصد کو عام کرنے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کے مضامین کا بڑا حصہ ہے۔

فاسد العقیدۃ صوفیوں کی وجہ سے تَصَوُّف بدنام ہو گیا

تَصَوُّف کو پیشہ ور، جاہ طلب، حقیقت فروش، الحاد شعار، نام نہاد صوفی حضرات دین میں تحریف کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور معاشرے میں انتشار پیدا کرنے اور آزادی اور بے قیدی کی تبلیغ کرنے کے لیے تَصَوُّف کو آلہ کار بنایا اور خود کو اس کے محافظ اور علمبردار ظاہر کر کے لوگوں کے سامنے آئے۔ کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبے کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے ناآشنا تھے کہ وہ لوگ مقصد اور وسیلے میں تمیز نہ کر سکے کہ وہ لوگ بعض اوقات وسائل پر زور دیے اور مقصد کو نظر انداز کر دیے۔اور اس شعبے میں ایسی چیزیں داخل کیں جن کا اس سے تعلق ہی نہیں تھا اور اسی کو اس فن کی روح اور اس کا کمال قرار دیا بلکہ مقصود اور مطلوب سمجھ بیٹھے، بہرحال واقعات کبھی بھی یا اکثر انسان کی خواہش کے مطابق یا خواہش کے تابع نہیں ہوتے، ایسی صورت میں فراخ دلی سے سوچیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ محض ایک نئی اصطلاح اور ایک مُروّج (رائج) نام کی وجہ سے ایک دینی حقیقت اور دینی ضرورت سے ہم گریز کرنے لگے، کوئی بھی شخص کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی عمر میں تزکیہ نفس اور اصلاح حال سے بے

نیاز نہیں ہو سکتا، جب اپنے اندر کسی چیز کی کمی پاتا ہے تو اس کی تکمیل کے لیے مناسب مقام پر جانا پڑتا ہے۔

کیونکہ علمائے دین پر فرائض کا بار عام مسلمانوں سے زیادہ ہوتا ہے اس لیے اگر وہ درست نہ ہوں تو ان پر عذاب الٰہی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہے، کیونکہ معاملہ دماغ کا نہیں ہے بلکہ قلب سلیم اور قلب منیب کا ہے، نفس کا نہیں روح کا معاملہ ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم بندوں کی رضامندی اور نہ رضامندی میں گرفتار ہیں، حالانکہ مالک کی رضامندی اور نہ رضامندی کو پیش نظر رکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالم جلیل کو ۱۰ سال صوفیاء کی صحبت میں رہنے کی ضرورت پیش آئی، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم اور پرہیزگاری کے باوجود ابو حمزہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو پلکوں پر بٹھانے تیار تھے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے معقول اور منقول کے سمندر کھنگال ڈالے لیکن گوہر مراد کو پانے کے لیے بو علی فارمدی کے آستانے پر پہنچ کر سکون پائے، امام رازی جیسے مشہور متکلم نے شیخ نجم الدین کبریٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر رہتے علوم و کمالات کے باوجود اس درویش کے پاس قلب کا سامان پایا، جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ برسہا برس میدان علم کی بادیہ پیمائی کرنے کے بعد آخر میں شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بوریا نشین ہوئے اور ابو العباس شریح حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے اور ابو عمران حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے اور بخاری کا مشہور شاعر امام قسطلانی نے بھی قاہرہ میں خانوادہ سہروردیہ سے رشتہ قائم کیا۔

علم کے دھنی کو خانقاہ کے حجرے میں کیوں آنا پڑتا ہے؟

اس کا جواب: عالم جب اپنے اندر کسی چیز کی کمی پاتا ہے تو اس کی تکمیل کے لیے مناسب مقام پر جانا پڑتا ہے تاکہ کوئی ایسی بات سننے میں آئے جس سے دل کی کیفیت بدلے، یقین بدلے، ایمانی حلاوت نصیب ہو، پھر رسم اور صورت میں حقیقت پیدا ہو، ایک بات ذہن میں رکھیں کہ کوئی بھی عالم اگر یہ سمجھ لے کہ اب مجھے کسی سے کچھ سننے کی اور کہیں سے علم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں رہی تو اس کا خیال غلط ہے، کیونکہ کوئی بھی آدمی اصلاح حال سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، ہمیں کسی کا ذکر ہی کیا خود صحابہ کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی تھی کہ اپنے ایمان میں اضافہ کریں۔ اس لیے صحابہ کہا کرتے تھے کہ اؤ تھوڑی دیر بیٹھ کر ذرا ایمان کی باتیں کر لیں اور ایمان کا مزہ اٹھا لیں۔ اس سے پتہ چلا کہ جب صحابہ کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو بعد والے لوگ اس عمل سے کس طرح بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ عالم بھی کبھی کبھی سامع ہوں، قائل نہ ہوں اور کبھی صرف مستفید ہوں، مفید نہ ہوں اور کبھی مخاطب ہوں، مخاطب نہ ہوں اور ہمہ تن گوش ہو کر کسی اللہ والے کی باتیں سنیں، تاکہ قلب میں ایسی کیفیت پیدا ہو کہ وہ قلب کی زندگی ثابت ہو جائے۔

غرض اس گئے گزرے زمانے میں تو ہر ایک کو اپنے ایمان کو تازہ کرنے کی ضرورت ہے، حق بات یہ ہے کہ دین کی حقیقت انہی حضرات کے یہاں آکر معلوم ہوتی ہے، یہی مقام پر آنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا، بہر حال کہیں تو آدمی کو پتہ چلے کہ وہ محتاج ہے۔ ہمارے لیے دین کی حقیقت سنی سنائی چیز ہے اور اہل اللہ کے لیے دین کی حقیقت جانچی اور پرکھی ہوئی ہے، اس طرح بزرگان دین کے پاس جانے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم کو اپنی

صورت میں حقیقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اپنے قلب میں روح پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ان بزرگان دین کے پاس جو باتیں ملتی ہیں وہ سب ذہانت کا نتیجہ ہیں اور ذہانت کے در حقیقت چار درجے ہیں ایک سب سے پہلے زبان کی ذہانت کا درجہ، اس کے بعد دماغ کی ذہانت کا درجہ، پھر قلب کی ذہانت کا درجہ، پھر روح کے ذہانت شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان حضرات کی روح اتنی برّاق اور اسقدر سریع الادراک ہوتی ہے کہ آسانی سے خیر و شر میں تمیز ہو جاتی ہے، ان کے پاس جو شخص بھی آتا ہے خود کو یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ نہیں ہے اور اب تک وہ پُررَعُونَت اور فریب خوردہ ہی رہا۔

تَصَوُّف اور اسلام

حدیث: جبرائیل میں دین کے تین اجزاء کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) ایمان

(۲) اسلام

(۳) احسان

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرّہُ نے احسان اور اخلاص کو پورے دین کا مغز قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان ہی اخلاص اور احسان کو بعد کے دور میں زُہد و تَصَوُّف کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اکابر مشائخ نے تَصَوُّف کی یہ تعریف کی ہے "هُوَ تَعمِیرُ الظَاهِرَ وَ البَاطِنِ بِالطَّاعَۃ" (یعنی ظاہر و باطن اور قلب و قالب کو طاعت خداوندی سے آباد کر لینا ہے)۔

بہر حال تَصَوُّف خدا اور رسول ﷺ کے احکام ظاہرہ و باطنہ کی تعمیل و طاعت ہی کا نام ہے اور تَصَوُّف سے مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور اس کا طریق تحصیل، عبدیت اور اتباع سنت ہے۔

تَصَوُّف کے مشمولات

(۱) عبدیت کی تشریح

(۲) تصحیح عقائد و نظریات

(۳) محبت و معرفت خداوندی

(۴) اخلاق رذیلہ کا ازالہ

(۵) اخلاق حسنہ کی تحصیل

(۶) دوام اطاعت

(۷) کثرت ذکر و فکر

(۸) اپنی ذات کا افتقار

(۹) اللہ کی عظمت و جلال کا یقین

(۱۰) استحضار کے ساتھ لرزاں و ترساں رہنا

(۱۱) شرمندگی سے طاعات میں مشغول رہنا ہے۔

اکابر مشائخ نے تَصَوُّف کی ان حقائق کو قرآن اور سنت سے ثابت کرنے کے لیے کئی کتابیں مستقل تصنیف فرمائی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی حضور پاک ﷺ سے اور صحابہ کرام سے منقول مبارک دعاؤں میں بھی حقائق تَصَوُّف کے اس بات کے

لیے کافی وزنی اور واضح دلائل موجود ہیں اور سارا تَصَوُّف ان ادعیہ مبارکہ سے ثابت ہے،ان کا خلاصہ بطور نمونہ حسب ذیل ہے

رسول اکرم ﷺ نے خدا سے تضرُّع (گڑگڑانا)اور زاری کے ساتھ بارگاہ خداوندی سے عبدیت کاملہ، تقویٰ، خوف وخشیت، عشق و محبت، اور شوق دیدار، کثرت ذکر اللہ، دوام ذکر و مراقبہ اور رضائے الٰہی کا بار بار سوال کرنا، دل ودماغ اور اعضاء کے منور ہونے، تزکیۂ نفس، اخلاق حسنہ، مثلًا: اخلاص، صبر و شکر، رضاء بالقضا، قناعت، تواضع، تفویض وتوکل، گریہ وبُکا۔ رزائل و نفاق، طمع، بخل، علم غیر نافع، قلب غیر خواہش، کبر و ظلم، حسد و کذب، کینہ وغیرہ سے اجتناب کی دعائیں فرمائیں اور عمر شریف کے آخری حصے میں تسبیح و تحمید با استغفار، نیز خاتمہ بالخیر وغیرہ ادعیہ مبارکہ سے ان مقاصد اور مہمات تَصَوُّف کی مطلوبیت اور ضرورت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ زمانہ کبھی بھی اولیاء کرام اور صوفیاء عظام سے خالی نہیں رہا، عہد رسالت مآب،خلافت راشدہ، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، تابعین، تبع تابعین اور ما بعد کے ادوار سے لے کر تاحال یہ مسلسل اور متواتر ہے۔ چنانچہ ہر زمانے کے چوٹی کے علماء، فلسفی، قلمکار، مصنف، خطیب، مبلغ، استاد القراء، ماہر علوم دینیہ، اور مغربی علوم کے ماہر حضرات نے اپنے علمی کمالات کے باوجود اپنے وقت کے اولیاء کاملین سے بیعت و اصلاح کا تعلق رکھا ہے۔ کیونکہ اولیاء کرام کی تعلیمات، مواعظ، ملفوظات اور ان کی سوانح عمریوں میں رشد و ہدایت اور عشق و محبت کی چنگاریاں ہیں۔ ان کے مجاہدات اور ان کی محنتوں کی تفصیلات تیر و نشتر اور دوا اور مرہم کا اثر رکھتی ہے اور ان سے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آتا ہے۔ اس طرح اولیاء اللہ کے ملفوظات و تعلیمات سے مردہ دلوں کو زندگی ملتی ہے۔

کتب تَصوّف کے مطالعہ کی اہمیت

ترقی اور عروج، ادراک(understanding) کے ساتھ ہے مستند اور معتبر تَصوّف کی کتابیں مشائخ کی مجلس کا کام دیتی ہیں کہ اس میں ریا بھی نہیں استفادہ ہی استفادہ ہے کہ مطالعہ جس قدر زیادہ ہوگا ادراک اسی قدر زیادہ ہوگا اور جس قدر ادراک زیادہ ہوگا اسی نسبت سے معرفت کی منزلیں طے ہوتی ہیں، کیونکہ معرفت کا راستہ پَیروں سے نہیں طے کیا جاتا بلکہ ادراک اور فہم اور وجدان قلب سے طے ہوتا ہے۔اس لیے کہا جاتا ہے کہ سب منزلیں سالک کی ادراک میں طے ہوتی ہیں جہاں ادراک پہنچ جائے وہیں اس کی منزل ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں نفع بخش چیز کتب بینی ہے جو تہذیب جیسے موضوع پر لکھی ہوں۔ جن حضرات کے اندر استعداد اور لیاقت ہے ان کے ایمان کو تر و تازہ کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے۔ ایمان کبھی بھی ایک حالت پر.برقرار نہیں رہتا کبھی اس میں تازگی اور کبھی اس پر مراوئی چھا جاتی ہے اس لیے حدیث میں آتا ہے: (جدّدوا إیمانکم بِذکرِ لا الہ الا اللہ)

انسانی نفسیات کے ایک پہلو کا تجزیہ

یہ انسانی فطرت ہے کہ غم اور مایوسی، مصیبت اور پریشانی کے وقت اگر دیگر لوگوں کی مصیبتوں اور آزمائشوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، تو مصیبت زدہ کے دل کو ایک حد تک تسکین ہو جاتی ہے اور یہ سوچ کر اس کو قرار آجاتا ہے کہ میں اکیلا ہی اس آزمائش اور مصیبت میں مبتلا نہیں ہوں۔

مشرکین مکہ نے مکہ میں حضور اکرم ﷺ کو ہر قسم کی اذیت میں مبتلا کیا، تو حق تعالیٰ نے آپ کی تسلی کے لیے قران میں ۲۵ یا ۲۶ انبیاء سابقین کے مصائب کا تذکرہ فرمایا، جن کو ان کی امتوں کے ہاتھوں اذیتیں پہنچی تھیں۔ ﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ﴾ [هود: ۱۲۰] "اے محمد! (ﷺ) ہم نے دیگر پیغمبروں کے حالات آپ سے اس لیے بیان کیے ہیں تاکہ آپ کے دل کو تسکین و تسلی ہو جائے۔"

بالکل اسی طرح انسانی نفسیات کے اس پہلو کو مد نظر رکھ کر موجودہ سالکین وطالبانِ خدا اور مسافرانِ طریقت کے لیے ان سے پہلے مسافروں کے حالات جو ان کے سفر سلوک میں پیش آئے اور وہ بلائیں اور وہ مصائب جن کو انھوں نے برداشت کیا اور جو قربانیاں انھوں نے اپنی خواہشات اور لذتوں کی راہ میں پیش کیے، ان سب باتوں کی تفصیلات جو مستند کتابوں میں ملتی ہیں راہ روانِ راہ سلوک کے زخموں پر مرہم کا کام دیتی ہیں، ان کے عزم میں پختگی، ایمان میں تازگی، یقین میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ سر گرم سفر ہو جاتے ہیں

عمر بھر تجھ کو رکھے گا گرم سفر

منزلوں کو تیرا راہ گزر بولنا

پھر طالب خدا کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ ہر راہ پر چلتا اور ہر در کی طرف دوڑتا ہے اور اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ نیکی کے دروازوں میں سے کوئی دروازہ بغیر کھٹکھٹائے نہ چھوڑے، اس امید کے ساتھ کہ شاید کسی طرف سے مطلوب کا جلوہ نظر آ جائے۔

اک نہ اک شمع اندھیرے میں جلائے رکھیے
صبح ہونے کو ہے حالات بنائے رکھیے

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہان
نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی

کتب تَصَوُّف اور اولیاء اللہ کے حالات زندگی اور ان کے ملفوظات وغیرہ کے تعلق سے سب سے زیادہ سکون اور راحت ملتی ہے، کیونکہ ان کتابوں کا موضوع بھی حق تعالیٰ کی ذات و صفات، تزکیہ نفس، قلب کی صفائی اور اس کا قرب حاصل کرنے کے طریقے اور مشغول ہونے کے آداب، شیطان کے مکر، نفس کے حیلے، اہل اللہ پر بیتی ہوئی داستانیں ہی ہوتی ہیں اور یہی وہ موضوع ہیں جن سے بُوئے دوست آتی ہے اور دل کو قرار ملتا ہے۔

بس گئی ہے میرے احساس میں یہ کیسی مہک
کوئی خوشبو بھی لگاؤں تیری خوشبو آئے

اپنی عبادات معاملات اور معاشرت کے عیوب معلوم ہوتے ہیں، اپنے عقائد کے فساد سے آگہی ہوتی ہے، اپنے خیالات کے کھوٹ کا پتہ چلتا ہے، اپنی فکر کی نہ رسائی کا احساس ہوتا ہے، خود بینی کی جڑ کٹ جاتی ہے، علمی نشہ کا بھوت ٹوٹ جاتا ہے، "وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ" کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے، دل اور زبان ہر قسم کے گمان سے باز آجاتا ہے، اہل اللہ کی عبادت اور ریاضت سے اپنی غفلت، ان کی محنت و مجاہدات سے اپنی کم ہمتی، ان کے ترک ماسوا سے اپنی دنیا داری، ان کے صدق و اخلاص سے اپنی ریاکاری، ان کے صبر و تحمل سے و توکل سے اپنی حرص و

ہوس،ان کے معارف اور حقائق سے اپنی کوتاہ فہمی، ان کے علم سے اپنی جہالت،ان کی للّٰہیت سے اپنے نفسانیت کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔

چنانچہ حجۃالاسلام امام غزالی رحمۃاللہ علیہ کا قول سنیے: ”میں نے علماء کو بھی خوب دیکھا، حکماء کی صحبت بھی اختیار کی، فلاسفہ کو بھی خوب پر کھا، مگر جب حضرات صوفیاء سے ملا اور ان کے حالات سے واقف ہوا تو سب سے بہتر طریقہ مجھے انہی کا لگا اور میں اپنی تمام عالمانہ شان و شوکت کو چھوڑ کر انہی کے ساتھ قافلے میں شامل ہو گیا۔“

دیتا ہوں پتہ منزل مقصود کا تجھکو
گو میں نہیں پہنچا ہوں تو شاید کہ پہنچ جائے

تجھے خود اپنی خبر ہے لازم جہاں کے علم و خبر سے پہلے
مسافتِ قلب و روح طے کر سیاحت بحر و بر سے پہلے

سالکین کے کرنے کے اہم کام

(۱) تصحیح نیت: حق تعالیٰ کی ذات پاک ہی اس قابل ہے کہ اس کی پرستش کی جائے۔ کیا حق تعالیٰ جنت اور دوزخ کو پیدا نہ فرماتا تو عبادت کے لائق نہ ہوتا؟ دوزخ تو اس کے غضب کا مقام ہے اور جنت اس کی رضا کا مقام ہے۔ بندے کو تو اس کی بندگی سے کام ہے۔ اللہ کا دیدار ہی اس کے لیے جنت ہے۔ اس لیے دو باتیں زیادہ اہم ہیں (۱) نفس کی پاکیزگی، (۲) دل کو اللہ کی طرف متوجہ رکھنا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کے ظاہر اور باطن کا اتباع کرے تا کہ نفس کی پاکیزگی اسی قدر حاصل ہو سکے۔

(۲) صحیح عقائد: نیت کی اصلاح کے بعد سالک کو یہ دیکھنا چاہیے کہ میرے عقائد بھی صحیح ہوں اور اہل سنت والجماعت کے مطابق ہوں، کیونکہ عقائد کی صحت اور ان کی پاکیزگی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس کے لیے کسی مستند عالم یا شیخ سے اس کی تصحیح کرلیں غلط عقائد سے توبہ کریں۔

(۳) احکام فقہ اور تَصَوُّف: فقہ یعنی شریعت کا حکم عام ہے، جس میں تمام مخلوق شامل ہیں، سب پر شریعت کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ فقہ کا مقصد شریعت کے مراسم کا قیام ہے اور دین اور دین کے جھنڈے کو اونچا کرنا ہے۔ جس کی بنیاد علم ہے اس کے قواعد اور ضوابط کلیہ کا حکم رکھتے ہیں اور افراد اور اشخاص کے اختلاف کی وجہ سے شریعت کے احکام نہیں بدلتے۔ چنانچہ کسی فقیہ کا کسی صوفی کو حکم دینا اور کسی بات سے منع کرنا صحیح ہے، لیکن صوفی کا کسی فقیہ کو حکم دینا یا اس کی کسی بات سے انکار کرنا درست نہیں ہے، بلکہ صوفی احکام شرعیہ کے لیے فقیہ سے رجوع کرنا ضروری ہے، تاکہ وہ ان پر عمل کرے اور حقائق و معارف کے بارے میں بھی وہ فقہ کا محتاج ہے، تاکہ خلاف شریعت نہ چل پڑے اور شریعت میں اس کی وجہ سے کوئی خلل نہ پڑے۔

فقیہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ احکام میں صوفی سے رجوع کرے، بس تَصَوُّف شریعت کی محتاج ہے اور فقہ یعنی شریعت تَصَوُّف سے بے نیاز ہے، فقہ سے تَصَوُّف کی جانب رجوع زیادہ طلب اور ترقی شوق و کمال کے حصول کے لیے آسان ہے، لیکن اس کے برخلاف تَصَوُّف سے فقہ کی طرف رجوع دشوار ہے۔

(۴) سالک اختلافی مسائل سے بچے: علمائے دین کے باہمی اختلاف سے دور رہے۔ سالک اپنی توجہ اپنا مطلوب حاصل کرنے پر لگائے اور ہمہ وقت ذکر و فکر، عبادت و مجاہدہ میں لگا رہے۔ اختلافی مسائل برسوں سے چلے آرہے ہیں، جس کی

وجہ سے امت مسلمہ دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ یعنی مسئلہ علم غیب، مولود شریف، حضور ﷺ کا حاضر و ناظر ہونا، آپ کی بشریت کی بحث وغیرہ۔ علم غیب سوائے حق تعالیٰ کے کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔

شریعت نے عبادات، معاملات اور زندگی کے ہر گوشے میں احکام دے کر انسانوں کو پابند کیا ہے، تاکہ انسان اپنی خواہشات نفس کے تحت اللہ کے دین کو اپنی طرف سے نہ بگاڑ سکے، جب شریعت نے کسی دن یا کسی رات کو کسی عبادت کے لیے مخصوص نہیں کیا ہو اور کسی فعل کو کسی خاص شکل یا خاص کیفیت کے ساتھ مقید اور متعین نہیں کیا ہو اگر کوئی اپنی طرف سے کوئی قید لگائے اور کوئی شکل یا کسی کیفیت کو متعین کر لے اور اس کا التزام فرض اور واجب کی طرف کرے اور پھر ایسا نہ کرنے والے کو ملامت کرے تو سمجھ لو کہ یہ غیر مشروع ہے اور اسی کو اسلام میں بدعت کہتے ہیں کیونکہ ایسا کرنے سے حکم شرعی میں تغیر آتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دین کی کسی بات پر عقیدہ رکھنے کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہے۔ مشائخ یا صوفیاء حضرات کا قول یا فعل عقیدے کے لیے کوئی شرعی حجت نہیں بن سکتا، کسی بزرگ کو یا کسی مشائخ کو یا کسی اللہ کے مقرب کو کوئی الہام ہو جائے، یا کشف سے کوئی بات معلوم ہو جائے اور وہ اگر شریعت کے خلاف نہیں ہے تو خود صاحب کشف اس پر عمل کرے اس میں حرج نہیں ہے لیکن دوسروں کے لیے وہ حجت نہیں ہے۔

کسی مستحب کو ہمیشہ کرنا اچھی بات ہے مگر اس میں دوام مستحب نہیں ہے اور التزام بمعنی اصرار بدعت ہے، اصرار کی تشریح یہ ہے کہ کسی امر مستحب کو سنت موکدہ یا واجب کی طرح لازم سمجھ کر کرے اور ایسا اڑ جانا کہ اس کا ترک ایسا ہی دشوار ہو جائے، جیسے ضروریات دین کا ترک کرنا اور تارک کو ملامت بھی کرے۔

شریعت مطہرہ میں اعمال کی درجہ بندی

(۱)فرض

(۲)واجب

(۳)سنت مؤکدہ

(۴)سنت غیر موکدہ

(۵) نفل، مستحب، مندوب

(۶)مباح

(۷)حرام

(۸)مکروہ تحریمی

(۹)مکروہ تنزیہی

اعمال کی مذکورہ بالا درجہ بندی شریعت کی طرف سے اسی لیے ہے، تاکہ انسان غلو سے محفوظ رہے اور اعتدال سے باہر نہ جائے حد کے اندر رہے۔

عوام جن کا فیصدی عموماً ۷۵/ ہوتا ہے یہ لوگ شریعت کے اصولوں سے ناواقف اور اکثر نابلد اور کم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور اعمال کی شرعی حد بندیوں سے دور ہوتے ہیں۔اگر کوئی واقف بھی رہا تو شیخ کی بات کو شریعت پر ترجیح دیتا ہے۔یہی غلو ہے اس لیے اکثر لوگ مباح کام کو مستحب کی طرح کرتے ہیں اور کبھی مستحق کو واجب فرض کی طرح اہمیت دیتے ہیں اور کبھی نفل کی خاطر فرض کو ترک کر دیتے ہیں،ان کے ایسے اعمال اور خود ساختہ اعتقاد کی وجہ سے بدعات اور مکروہات

کا دروازہ کھل جاتا ہے۔اس طرح شریعت کے احکام میں یا دین میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔

عوام اگر احکام شریعت کو اہمیت دے کر شریعت کے احکام سے واقف ہو کر سلوک اور تَصَوُّف کی طرف رُخ کرتے تو ایسی غلطی نہیں کر سکتے تھے، لیکن رونا یہ ہے کہ شریعت کے احکام کا جاننا عوام کے حق میں لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہو گیا اور دوسری طرف صوفی نما ایمان فروش زمانہ ساز لوگ تَصَوُّف کو اپنی روٹی روزی کا ذریعہ بنا لیے، جس کی وجہ سے جاہل لوگ شریعت کو ترک کر کے تَصَوُّف کے پیچھے پڑ گئے۔

چنانچہ دین اسلام میں ایسے تَصَوُّف سے اس قدر زبردست فساد پھیل گیا اور دین حق اس قدر بری طرح سے متاثر ہوا کہ لوگوں کی اکثریت حقیقی تَصَوُّف کی اہمیت کو بھی نظر انداز کرنے لگ گئے جو کہ غلط بات ہے۔

مولود شریف

رسول اکرم ﷺ کا ذکر مبارک خواہ ولادت شریفہ کا ہو، وفات شریف کا ہو، غزوات کے حالات ہوں، یا حلیہ شریف کا بیان ہو، غرض آپکو کسی عنوان سے بھی یاد کرنا ہو یہ دونوں جہاں کی سعادت کا سبب ہے، کیونکہ کثرت ذکر سے مذکور کی محبت پیدا ہوتی ہے یا جس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اس کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

خدا سے عشق، محمد پہ جاں فدا کرنا

یہی ہے وصل، اسی کو سلوک کہتے ہیں۔ شریعت نے حضور اکرم ﷺ کے ذکر مبارک کے لیے کوئی قید اور کوئی شرط نہیں مقرر کی ہے، نہ کوئی دن متعین کیا ہے اور نہ ذکر کے لیے کوئی ہیئت اور کوئی شکل مقرر کی ہے۔ اب اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کا خود ساختہ فعل ہو گا اور یہ اس کے ذمہ داری ہو گی، اس کا یہ فعل مستحب کے درجے میں بھی نہیں آ سکتا، کیونکہ مستحب شرعی حکم ہے اور اس کے لیے بھی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ استحباب تو اونچی چیز ہے مباح فعل بھی حضور اکرم ﷺ کے قول اور فعل کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا۔ صرف ۱۲/ ربیع الاول یا سال میں کسی ایک دن حضور علیہ السلام کا ذکر مبارک بیان کر کے ایصال ثواب کر کے باقی پورے سال آپ ﷺ کو بھلائے رکھنا اور سمجھنا کہ ہم نے آپ کی محبت کا حق ادا کر دیا، یہ تو خاص دین داروں اور رسم پرستوں کا عمل ہے۔ آپ کے احسانات امت پر اس قدر ہیں کہ ہم ان کو ادا نہیں کر سکتے، اللہ کا راستہ چلنے والے کا کوئی فعل رسم و عادت کے طور پر نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر فعل اتباع رسول کے مطابق ہو۔

نذر و نیاز

نذر کا مطلب ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کوئی ایسا کام واجب کر لے جو شریعت کی جانب سے اس کے ذمے واجب نہ ہو، ایسے کام کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ الٰہی میرا فلاں کام پورا ہو گیا تو ۱۰/ غریبوں کو کھانا کھلاؤں گا، اب جب کہ اس کی مراد پوری ہو گئی، کام ہو گیا تو اپنی نذر پوری کرنا واجب ہے۔ اس کے برخلاف مزار پر جا کر نذر ماننا اور صاحب مزار سے حاجت روائی چاہنا کہ اگر میرا کام ہو گیا تو اتنے محتاجوں کو کھانا کھلاؤں گا وغیرہ ایسی نذر ماننا باطل ہے اور حرام عمل

ہے۔اس لیے کہ نذر مخلوق کے لیے ہوئی اور نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لیے حرام ہے۔اس لیے دراصل نذر و نیاز سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ ہی کے نام سے کسی بزرگ کی روح کو ایصال ثواب یعنی ثواب پہنچایا جاسکتا ہے کیونکہ نذر اور ثواب خدا کے بندوں کو پہنچانا جائز ہے۔

میت کے لیے سویم، چہلم، برسی وغیرہ

میت یہ مرحوم کے لیے جو مُرَوّجہ سوئم اور چہلم وغیرہ کے نام سے ہوتی ہے، پہلی تو یہ سمجھ لیں کہ ان رسموں میں سے کوئی چیز بھی سوائے ایصال ثواب کے ثابت نہیں ہے۔ جیسے سوم میں تیسرے دن کا تعین اور چہلم میں ۴۰/دن کا تعین اور سوئم میں چنے، مُرمُرے نقل وغیرہ لوگوں میں تقسیم کرنا اور برادری، اہل محلّہ اور دوست واحباب کو کھانا کھلانا، نفس ایصال ثواب یہ ہے کہ حسب استطاعت بغیر تاریخ اور دن مقرر کیے محتاجوں کو مرحوم کے نام سے جو کار خیر کیا جاتا ہے اس کا ثواب مرحوم کو پہنچانا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ مرحوم کو ثواب پہنچے اور ثواب موقوف ہے اس بات پر کہ ایصال ثواب شرع کے مطابق ہو۔اس کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ مال کو پوشیدہ طور پر اہل حاجت کو دے دیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ کھانا پکا کر لوگوں کو کھلایا جائے، لیکن اس صورت میں ریا یا اظہار فخر ہو تو پھر فضول ہو گیا کہ خرچ بھی ہوا اور میت کو ثواب بھی نہ پہنچا۔آج کل کی رسموں میں یہی پہلو غالب ہے۔۹۵/فیصد اس کا چلن ہے، کیونکہ لوگوں کی خاطر یہ کام کرنا پڑتا ہے کہ اگر کچھ نہ کیا تو لوگ کہیں گے کہ مال کا وارث ہو گیا اور میت کے نام سے کچھ بھی ایصال ثواب نہیں کیا، لیکن افضل کام تو لوگوں کو چھپا کر دینا ہی ہے۔

خلاصہ : حقیقت کا جاننا مبنی ہے علم صحیح پر اور علم صحیح مبنی ہے قرآن اور حدیث پر اور اس کی عملی تصویر رسول اکرم ﷺ ہیں، خلفائے راشدین ہیں، صحابہ کرام ہیں، حقیقت پسندی زندگی کا سب سے بڑا راز ہے، حقیقت پسند انہ جد و جہد ضروری ہے ،جو موجودہ دنیا حقیقتوں کی دنیا ہے، یہاں حقیقت سے مطابقت کر کے آپ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں، خدا کی اس دنیا میں چھوٹی بڑی اور خواب و خیال کی باتوں سے زیادہ بے معنی اور چیزیں نہیں ہیں۔ جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اسلام سراسر علم ہے۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤلف و جملہ معاونین و اہل و عیال کو اجر کثیر سے نوازے اور اس کتاب کو ان کی میزان میں حسنات کا ذخیرہ بنادے اور اس کا نفع عام فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت کا یقین، عقل سلیم اور فکر مستقیم عطا فرمائے۔

مؤلف

الحاج قاری محمد ارشاد علی

مولوی عالم (نظامیہ) بی۔ کام (عثمانیہ)

ڈی۔ یف۔ ی۔ ناگپور کالج

" مولف کتاب "اصلاحی تحفہ" خادم تدریس القرآن باہتمام

باہتمام

صاحبزادہ محمد طاہر علی